آبِ بقا

غالب کی منتخب غزلوں پر

ش۔م۔ عارف ماہر آروی

کی

۳۵ غزلیں

ناشر:-
حلقۂ احباب آرا
قیمت: دو روپیہ

خالص اللہ کی رضا اور جذبۂ خدمتِ خلق کے تحت کتب کی پی ڈی ایف فائلز بنائی جاتی ہیں۔
کسی بھی قسم کا کاروباری مفاد پیشِ نظر نہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔ شکریہ

PDF By : Ghulam Mustafa Daaim

مرتّب :- پروفیسر ڈاکٹر سمیع الحق حزیں، ایم۔ اے، ڈی۔ لٹ
صدر شعبۂ فارسی و اُردو، رانچی کالج، رانچی

ناشر:- حلقۂ احباب، آرا
(معرفت تاج پیامی، معتمد (جگدیش پور ہاؤس۔ محلہ مہادیوا، آرا)

کتابت :- سوز داناپوری
طباعت :- لیبل لیتھو پریس، رمنہ روڈ۔ پٹنہ ۴
سال طباعت :- فروری ۱۹۷۳ء۔ (محرم ۱۳۹۳ھ)
تعداد :- ۵۰۰
قیمت :- دو روپیہ

ملنے کے پتے :-

مکتبہ حلقۂ احباب، آرا
حاجی شرف الدین، گوپالی چوک، آرا
شگفتہ اکاڈمی، برہ بترہ، آرا

عکس دروں

عرضِ حال

اقلیم انسانیت کے شہنشاہ، بحرِ محبت کے میناۂ ضوبار، فضائے خلوص کے شہباز، دشتِ تحقیق کے صحرا نورد، صنمِ شاعری کے پرستار، شہرِ ادب آرا کے قاضی اور حلقۂ احباب آرا کے گاندھی۔ یہ ہیں جناب ش۔ م۔ عارف، ماہر آروی۔

غالب نے اپنے بارے میں کہا تھا: ؎

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے

ذرا تصرف کے ساتھ یوں بھی کہا جا سکتا ہے: ؎

ہوگا کوئی ایسا بھی جو ماہر کو نہ جانے

جناب ماہر آروی جس قدر اپنی تحقیق، شاعری، افسانہ نگاری کے لئے مشہور ہیں۔ اسی قدر وہ اپنے خلوص و اخلاق اور انسانیت و محبت کے لئے مشہور ہیں۔ کسی نے سچی محبت کی تعریف یوں کی ہے: "دوسرں کی ضرورتوں کا صحیح بروقت اندازہ اور اسے غیر محسوس طور پر پورا کر دینا ہی سچی محبت ہے" یہ بات جناب ماہر آروی پر بالکل صادق آتی ہے۔ وہ انسان سے بھی محبت کرتے ہیں اور ادب سے بھی۔ اور دونوں کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔

جناب ماہر آروی کے تحقیقی مضامین، غزلیں اور افسانے برابر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ "سنگِ گراں" میں جناب ماہر کی تیس ۳۰ غزلیں، راقم الحروف کے پانچ افسانے اور جناب ظفر رضوی کاکوی کی بھی تیس ۳۰ غزلیں شائع ہوئی تھیں ظفر رضوی ۱۹۷۱ء میں حلقۂ احباب آرا کے معتمد تھے۔ انہوں نے جناب ماہر آروی سے فرمائش کی تھی کہ وہ غالب کی زمین میں غزلیں کہیں اور اسے الگ سے شائع کرائیں۔ مجھے نہایت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ آج جب میں حلقۂ احباب آرا کا معتمد ہوں تو جناب ماہر آروی کی وہی غزلیں "آبِ بقا" کے نام سے حلقۂ احباب آرا شائع کر رہا ہے۔ ؎

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

(معتمد حلقۂ احباب آرا، جگدیش پور، بھوجپور، بہار) **تاج پیامی** ... ۳۱ر جنوری ۱۹۷۳ء

عرض مرتّب

اس نمائش کی دنیا میں خاموش جدوجہد کرنے والوں کا بھی ایک مقام ہے اور جو سچ پوچھئے تو انہیں کے دم سے شمعِ حیات روشن ہے۔ کیونکہ انہیں کے دم قدم سے تعمیر و تشکیل کے پروگرام چل رہے ہیں۔ ایسے افراد اپنے اندر اتھاہ امکانات کے متحمل ہوتے ہیں اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ جھیل لیتے ہیں، مگر داد کے طلبگار کبھی نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہ شعر ؎

منصب و شہرت کا طالب ہے جہاں
ہم بھی اوروں کی طرح ہو جائیں کیا

اسی انفرادیت کا غماز ہے۔

متذکرہ شعر برادر محترم جناب شمس۔م۔عارف ماہر آروی کا ہے اور اس شعر میں موصوف کی زندگی کا وہ خاکہ ہے جو گذشتہ بیس، پچیس سالوں سے میری نظر میں ہے۔

ماہر صاحب جس طرح مجھ سے عمر کی مسافت میں محض دو ایک قدم آگے ہیں۔ اسی طرح وہ طالب علمی کے دور میں بھی دو ایک درجہ آگے تھے۔ پہلی بار آرا جین کالج میں میرا اُن کا گہرا ربط قائم ہوا۔ ہماری دوستی کی طرح ایوں پڑی کہ:

ایک دن مجھ جین کالج کے پرنسپل صاحب کے دفتر کے سامنے کھڑے نظر آئے۔ میں اسی طرف سے گذر رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی بلایا۔ میں ان کی طرف بڑھا خیریت پوچھی وہ فرمانے لگے:

"بھائی! آپ لوگ ایک طرف تو کہتے ہیں اُردو کا کوئی مستقبل نہیں اور دوسری طرف عملی طور پر کچھ اس کی بقا کیلئے کرتے نہیں۔ آپ کو معلوم ہے نا، اس کالج سے میگزین نکلتا ہے۔ اس سال بھی نکلنے جا رہا ہے۔ مگر حیف! اب تک اُردو کے لئے اس میں ایک صفحہ بھی نہیں رہا ہے۔ میرے ساتھ چلئے۔ پرنسپل صاحب سے مل کر کالج میگزین میں اُردو سکشن کا اضافہ کرایا جائے۔"

ماہر صاحب اس وقت غالباً بی۔اے (آنرز) کے آخری سال میں تھے اور کالج

بزم ادب میں اپنے درجہ کے محض ایک نمائندہ تھے۔ چنانچہ میں نے عرض کیا کہ ماہر صاحب بزم ادب کے سکریٹری کو تو لے لیجئے تاکہ کیس مضبوط ہو سکے۔ مگر ماہر صاحب نے یہ کہتے ہوئے میری تجویز نامنظور کر دی کہ "کیا آپ کو نہیں معلوم کہ وہ اس سلسلے میں آج تک متحرک نہیں ہوئے۔ انہیں اگر اس کا احساس ہی ہوتا، تو وہ خود ہم سبھوں کو اس کی اہمیت دلاتے۔ اگر آپ کو کاز کے صائب ہونے کا احساس ہے، تو ساتھ چلئے، ورنہ میں تنہا ہی جا کر ملتا ہوں۔"

میں لاجواب ہو گیا اور ساتھ ہو لیا۔ جم کر اپنے کاز کو پیش کیا گیا۔ پرنسپل صاحب راضی ہو گئے کہ اُردو کا کچھ صفحہ بھی میگزین میں ہونا چاہیئے۔ مگر پاس ہی بیٹھے ایک بزرگ استاد نے تُرپ کا پتّہ پھینکا — "اگر مضامین معیاری نہ ہوئے تب!"

بہ ظاہر بات مناسب تھی۔ مگر جس انداز میں کہی گئی تھی اس سے ہمیں اندیشہ تھا کہ شاید اس سال بھی کالج میگزین میں اُردو کا سکشن شروع نہ ہو سکے گا۔ اس وقت ماہر صاحب کا استقلال قابلِ تحسین تھا۔ انہوں نے دوڑ دھوپ کر کچھ مضامین، افسانے، نظمیں، غزلیں طلبا سے لکھوا کر آ دم لیا۔ مجھے بھی ان کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی تھی۔ میں نے ڈاکٹر عشرت انور کا ایک مطبوعہ مقالہ — Ethical Philosphy of Omar Khaiyam کا ترجمہ کر کے ان کے حوالہ کر دیا۔ ماہر صاحب نے قلم برداشتہ ایک انشائیہ بعنوان "آزادی کا رخ" لکھا تھا۔ تمام تخلیقات انہیں بزرگ استاد کے سپرد کر دی گئیں۔ میرا مضمون، ماہر صاحب کا انشائیہ اور کچھ اور تخلیقات "معیاری" قرار دی گئیں اور پہلی بار جین کالج آرہ کے میگزین میں اُردو کو نمائندگی ملی اور پھر ہمیشہ کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔

ماہر صاحب کی خدمت اُردو کی یہ کوئی واحد مثال نہیں ہے۔ اُردو اور شاہ آباد کے معاملہ میں ماہر صاحب بڑے فعال ہیں۔ تقسیم کے بعد جو ادبی جمود آرہ میں ہو گیا تھا۔ اسے توڑنے کا سہرا بھی بڑی حد تک موصوف ہی کے سر ہے کہ انہیں کی انتھک محنت نے حلقۂ احباب، آرہ جیسی فعال، باضابطہ خالص ادبی انجمن قائم کر کے ایک بار پھر علم و ادب اور سخن فہمی کا چرچا آرا میں عام کر دیا۔

اردو کی بقا کے لئے ماہر صاحب اکثر آرہ کے نزدیک و دور کے قریہ میں جاتے رہتے ہیں

وہاں کے بچوں کو اُردو لکھنے پڑھنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ انہیں اپنے پاس سے ابتدائی کتابیں، سلیٹ، پنسل وغیرہ مفت تقسیم کرتے ہیں اور انہیں کسی بزرگ کے حوالے کر کے اس بزرگ کی گمنام خدمت کر دیا کرتے ہیں۔ "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" کے مقولہ پر عمل کرتے ہوئے چپکے چپکے وہ بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔

آرہ اور شاہ آباد کے خفتگانِ علم و ادب کو روشناس عالم کرانے میں ماہر صاحب کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ گیارہ سالوں سے ہر ماہ ماہنامہ "المجیب" پھلواری شریف (بہار) میں ماہر صاحب کسی نہ کسی عنوان سے آرہ کے شعراء و ادباء پر تحقیقی مضامین سپردِ قلم کرتے آ رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مضامین کو مستقل کتابی صورت میں یکجا کر دیا جائے۔ تاکہ آرہ کی تاریخ علم و ادب پر کام کرنے والوں کے لئے مددگار ثابت ہو سکے۔ مگر یہ کام ماہر صاحب کی تہی دستی سے ممکن نہیں ہے۔ کسی انجمن یا اکاڈمی کو ان کی اجازت سے اس کے طباعت کا نظم کرانا چاہیئے۔

ماہر صاحب اپنی کمزور صحت اور دفتری مشغولیت کے باوجود مشاعرہ، ادبی تبلیغ، مطالعہ اور دیگر ادبی کارکردگی کے لئے وقت نکال ہی لیتے ہیں، جو اچھے اچھوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ گھر ہو یا دفتر، دوست ہو یا دشمن، رسالہ ہو یا اخبار، حلقہ احباب ہو، یا انجمن ترقی اُردو، مدرسہ ہو یا جامعہ اردو، ہر جگہ ماہر صاحب کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بندۂ خلوص، استقلال کا دھنی، عزم و ارادے کا پختہ، محنت اور لگن کا مردِ آہن ہے۔

حلقۂ احباب، آرہ نے انہیں خوبیوں کے پیشِ نظر ان کی ۱۳۵ ایسی غزلوں کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرانے کی ان سے گزارش کی تھی، جو انہوں نے غالب کی زمین میں کہی تھیں۔ انہیں راضی کرنے میں تقریباً دو سال لگ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں قطعہ تاریخ ۱۳۹۱ھ کی نظر آئے گی۔ جبکہ کتاب ۱۳۹۳ھ میں منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ جو آپ کے سامنے "آبِ بقا" کی صورت میں حاضر ہے۔

ڈاکٹر سمیع الحق (حزیں آروی) ڈی۔ لٹ
صدر شعبۂ فارسی و اُردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی، بہار
۲۷ جنوری ۱۹۷۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آہنگِ غالب

اور

جناب ماہر آروی

غالب کو اپنی شاعرانہ آہنگ کا شدید احساس تھا۔ اس کی ایک جھلک دیکھئے :۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

قلم ز نسبت دستم نہال روضۂ خلد
ورق ز صنعت کلکم نگارخانۂ چین

مری فکر گہر اندوز اشارات کثیر
کلک مری رقم آموز عبارات قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

غالب کی شخصیت اور ان کے فن کی انفرادیت سے نہ صرف ان کا عہد ہی

لطف اندوز اور اثر پذیر ہوا۔ بلکہ آنے والی نسلیں بھی متاثر ہوئیں۔ اس تاثر کے مختلف اسباب ہیں۔ لیکن ایک اہم سبب یہ ہے کہ غالبؔ کا عہد اور غالبؔ دونوں ذہنی ناآسودگیوں، قلب و نظر کی محرومیوں، اور دل کی بے اطمینانیوں کے شکار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کے ایوان سخن میں ان کی اپنی داخلی کشمکش، تشویش، تردد، اضطرا اور کرب کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ عہد حاضر کے بیشتر شعراء بھی غالبؔ ہی کی طرح تشکیک، بے یقینی، بے اطمینانی اور نت نئی محرومیوں کے شکار ہیں۔ اس لحاظ سے آج کی نئی نسل کے شعراء غالبؔ کے ہمنوا اور ہمراز ہیں۔ زندگی کی پیچیدگیوں اور تصلیتوں کی اس مماثلت کا نتیجہ ہے کہ عہد حاضر کے بیشتر شعراء نے غالبؔ کے فن کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی شاعری کے اندر سمونے کی سعی کی ہے۔ یہ اسی تاثر اور تقلید کا فیض ہے کہ غالبؔ کے اشعار کی تضمین کی گئی۔ غالبؔ کی زمین میں غزلیں لکھی گئیں۔ غالبؔ کے آہنگ شعری کو اپنایا گیا۔ بیسوی صدی کے بیشمار اُردو فن کاروں نے غالبؔ کی تشبیہوں اور فارسی ترکیبوں کو استعمال کیا اور برتا ہے۔ ان کے یہاں اندازِ غالبؔ اور اس کی نزاکتوں کو فن میں سمونے اور اتارنے کے آثار نمایاں ہیں۔ غالبؔ کی زمین ہر عہد میں نکتہ دانوں کے لئے صلائے عام رہی ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہوگا، جس نے غالبؔ کی زمین میں دو ایک غزل نہ کہی ہو، یا غالبؔ کی غزلوں یا اشعار کی تضمین نہ کی ہو۔ اساتذہ فن تو کیا مبتدی اور نومشق بھی زمین غالبؔ سے آشنائی کا دم بھرتے رہے ہیں۔ اس آشنائی کا تصرف ہے کہ مجروحؔ سے روشؔ صدیقی (مرحوم) تک اور صفیرؔ و شادؔ سے ماہر آردی تک غالبؔ کی زمین میں طبع آزمائی کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے رہے ہیں۔ اُردو کیا فارسی زبان میں بھی ایسا شاعر نہیں ملتا۔ جس کے مکمل دیوان کی تضمین کی گئی ہو۔ غالبؔ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس کے مکمل اُردو دیوان کی تضمین کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ تلامذہ غالبؔ میں مجروحؔ نے سب سے زیادہ غالبؔ کی غزلوں کی تضمین کی ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرزا اسہارن پوری

نے غالب کے مکمل دیوان اُردو کی تضمین کی ہے، جو "روح کلام غالب" کے نام سے
سنہ ۱۹۳۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی۔ مرزا عزیز بیگ مرزا غالب کے تلمیذ
رشید حبیب الدین سوز الہ آبادی کے شاگردوں میں تھے۔ زمین غالب کا انتخاب
اور اس پر طبع آزمائی اردو شاعری کی ایک دیرینہ روایت بن چکی ہے۔

جناب ش۔م۔ عارف ماہر آروی، بہار کے اُبھرنے والے شعراء میں اس لحاظ
سے منفرد ہیں کہ انہوں نے غالب کے آہنگ کو اپنایا ہے۔ غالب کی زمین میں طبع آزمائی
کی ہے۔ جناب ماہر آروی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ بہار کے تمام اُدبی حلقے
آپ کو خوب جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔ آپ کی بیشمار غزلیں ایک عرصہ دراز سے اُردو
ماہناموں اور روزناموں میں شائع ہو رہی ہیں۔ آپکے ادبی مضامین بھی برابر شائع ہوتے
رہتے ہیں۔ شاہ آباد کے قدیم و جدید شعراء کا ایک تذکرہ بھی آپ ترتیب دے چکے ہیں۔
جناب ماہر کی ادبی منصوبہ بندی میں شعرائے بہار کا ایک تذکرہ لکھنا بھی ہے۔ آپ شاعر
بھی ہیں، مضمون نگار بھی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر محافظ ادب بھی ہیں۔ آپ کے
سوانح حیات اور آپ کے ادبی خدمات کی روئداد "سنگ گراں"[1] میں دیکھی جا سکتی ہے۔

غالب کا آہنگ شعری کچھ ایسا منفرد اور ممتاز ہے کہ اس کی نقل کوئی آسان
کام نہیں۔ لیکن یہ جرأت رندانہ ہی ہے کہ جناب ماہر آروی کے یہاں غالب
کی چند زمینوں کو خوش اسلوبی سے برتنے کی کوشش ملتی ہے۔ غالب کی شخصیت
اور ان کے فن میں خودداری اور انانیت کو خاص مقام حاصل ہے۔ جناب ماہر
آروی کے فن میں بھی جابجا خودداری کی جھلک ملتی ہے۔ ؎

منصب و شہرت کا طالب ہے جہاں ✣ ہم بھی اوروں کی طرح ہو جائیں کیا

---

[1] حلقہ احباب آرہ کی ادبی منصوبہ بندی کی نویں اشاعت "سنگ گراں" کے عنوان
سے اکتوبر سنہ ۱۹۷۱ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ ماہر آروی اور ظفر رضوی کی غزلوں
اور نتائج پیامی کے افسانوں کا انتخاب ہے۔

ک

گشتۂ دوراں جو ہو ماھرؔ اُسے
مرغِ بسمل کی طرح تڑپائیں کیا

سرخ رو ہو نہ سکے گا کوئی ہم رنگِ شفق
رنگ لائے گی مگر تیری حنا میرے بعد

مجھ سے ہی تیرے باغ کی ہے ساری آبرو
گر میں نہیں تو پھر یہ ترا گلستاں نہیں

اللہ رے ذرّۂ قطرۂ پیہم میں اشک کے
ایمان سے کہو تو کہ یہ کہکشاں نہیں

غالبؔ کی طرح مجھ کو بھی حاصل ہے سو شرف
اک شاعری ہی ذریعۂ عزت نہیں مجھے

نا نہیں طاقتِ گفتار یہ ماھرؔ کو مگر
دل پہ گزری ہے کچھ ایسی کہ سنائے نہ بنے

مانا کہ خون دل میں ڈبو لی تھیں انگلیاں
حالاتِ دل نہ اس پہ بھی ہم سے رقم ہوئے

وہ بھی کہتے ہیں تو تسلیم ہے مجھ کو ماھرؔ
مجھ سا دنیا میں نہیں کوئی بُرا میرے بعد

غالبؔ کے فن کا ایک اہم موضوع فلسفۂ حیات و کائنات بھی ہے۔ غالبؔ نے اس مئے دو آتشہ کو اپنے خون جگر کی سرخی عطا کی۔ گلابی گلابی نہ رہی۔ بادہ خوناب

بن گئی۔ غالب بے ثباتی حیات و کائنات کا ماتم نہیں کرتے، وہ حیات و کائنات کو محض فانی نہیں سمجھتے۔ وہ موت حیات اور کائنات کے مثلث کو ایک واضح اور مثبت حقیقت سمجھتے ہیں۔ ان کی حقیقت پسندی صوفیوں اور فلسفیوں کی ماورائیت سے بہت پرے اور مختلف ہے۔ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

جناب ماہر آروی نے نہ صرف غالب کی زمین کو اپنایا ہے، بلکہ انہوں نے غالب کی آہنگ شعری کو مشعل راہ بنا کر حیات و کائنات کے موضوع پر بھی اپنی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا یہ تجربہ قابل قدر ہے: ؎

موت کیا ہے، حیات کیا شے ہے
آج تک حل یہ مسئلہ نہ ہوا

یہ عمر مختصر ہنس رو کے بھی تو کاٹ لے کوئی
مزا آ جائے جینے کا ہماری طرح جب کاٹے

زندگی کی آرزو گر دل میں ہے
پھر تو پتھر سا کلیجہ چاہیے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہی اس کو جانیے
دیکھنے میں زندگی یوں تو بہت گلفام ہے

لیل و نہارِ زیست میں لوگ اُلجھ کے رہ گئے
دنیا تو دیدنی نہ تھی، کس کو مگر یہ ہوش ہے

غمِ فراق، غمِ زندگی، غمِ دوراں ؛ بلائیں سینکڑوں اک جانِ ناتواں کے لئے

زلفِ دراز بن کے اُلجھتی رہی مدام
اِک تارِ عنکبوت ہے، دنیا کہیں جسے

جناب ماہر آروی کے اکثر اشعار ان کے اپنے تلخ و شیریں تجربات کے آئینہ دار ہیں۔ ان سے ان کے شاعرانہ ذہن کی عکاسی ہوتی ہے۔ اور یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ ان کا لب و لہجہ تکلف نا آشنا ہے، وہ اکثر بڑی سادگی سے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ غالب کی زمین میں زبان و بیان کی یہ شگفتگی ان کی ریاضت، مہارت اور پختگی کی واضح علامت ہے۔ ؎

یہ خیالِ خام ہے ہوگا، وہ میرا آشنا
غیر کو دیکھا ہے اکثر ہوتے اپنا آشنا

زمیں تانبے کی ہوتی جا رہی ہے
سوا نیزے پہ سورج آگیا کیا

ذوقِ طلب جو رکھتا ہے غم کا خزانہ مانگ
اس کے علاوہ بھول کے کوئی دعا نہ مانگ

تقاضا حبسِ زمانہ یہ ہم سے کرتا ہے
گھٹ اور گھٹ کے ہی مر، سانس تک نہ باہر کھینچ

شرطِ الفت برہنہ پائی ہے
پاؤں میں کس کے آبلہ نہ ہوا

تیرگی میں مل نہیں سکتے کبھی نقشِ قدم
چھیڑ اے دل ذکر اس کے حسن کی تنویر کا

کتنے ایوانِ فلک بام، زمیں بوس ہوئے
کیا قیامت ہے دلِ زار کا نالاں ہونا

ہائے یہ فطرتِ حسن اُف وہ مزاجِ نازک
ناز اٹھانا بھی جو چاہوں تو اٹھائے نہ بنے

"آبِ بقا" — جناب ماہر آروی کی ان غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جو غالب کی زمین میں ہیں۔ اس میں آہنگ غالب کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس میں غالب کی طرح فن کار کی شکست آرزو اس کی نامرادیوں اور محرومیوں، اس کے اضطراب اور کرب کی دھمک بھی محسوس ہوتی ہے۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے اور بہار میں غالبیات کے سلسلہ کا ایک حسین اضافہ!

ذکی الحق
شعبۂ اردو
بہار نیشنل کالج پٹنہ یونیورسٹی۔ پٹنہ ۴

۲۲ر جنوری ۱۹۷۳ء

انتساب!

غالبؔ کے نام!!

غالبؔ کی زبان میں!!!

؎ جوابِ خواجہ نظیری نوشتہ ام غالبؔ
خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم!!!!

(ش۔ م۔ عارفؔ) ماہر آروی
فروری ۱۴، ۱۹۷۳ء
مطابق دس محرم الحرام ۱۳۹۳ھ
۵۷۶ ہائی کورٹ فلیٹس۔ لال بہادر شاستری نگر پٹنہ۔۱

ع وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

محبت بحرِ آتش ہے نہ اُترا جائے ہے مجھ سے
مگر دریا میں رہ کر بھی نہ ترسا جائے ہے مجھ سے

طبیعت ہی کہاں مانے ہے بے تم سے ملے ہمدم
یہ وقتِ لطفِ تنہا کب گذارا جائے ہے مجھ سے

تعلق بھی عجب رشتہ ہے دو دل جس سے ملتے ہیں
نہ جوڑا جائے ہے اُس سے نہ توڑا جائے ہے مجھ سے

میں ملتے دیکھتا ہوں یوں تو دونوں لب کبھی اُس کے
مگر آہستہ ایسا کچھ نہ سمجھا جائے ہے مجھ سے

عتاب! اُس آفتِ جاں کا، ستم، اس فتنہ پیکر کا
اگر ہے دیدنی، پھر کیوں نہ دیکھا جائے ہے مجھ سے

ضعیفی آ گئی ایسی کہ ماشا کیا کہوں تم سے
اگر بیٹھا کبھی تو پھر نہ اُٹھا جائے ہے مجھ سے

ع دیکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوھر کھلا

تابشِ دنداں سے ان کے رشتۂ گوہر کھلا
آسماں پر جلوۂ رخسار سے اختر کھلا
سامنے بیٹھے تھے، وہ خلوت تھی، اور کوئی نہ تھا
ایسے عالم میں ہمارے شوق کا دفتر کھلا
منکرِ اُس بُت کے جو ہیں، پاتے ہیں وہ اچھی سزا
چومتے ہیں جا کے کعبہ میں وہی پتھر کھلا
میں شمیمِ نکہتِ گُل کا کہاں پاؤں دماغ
سامنے یوں تو نگاہوں کے ہے اِک منظر کھلا
جب چلی اوروں پہ کیا بے آب ہو کر رہ گئی
میری گردن پر چلی تب تیغ کا جوھر کھلا
اِک طلسمِ آب و گِل ہی تو ہے ساری زندگی
راز یہ کوئی بتائے جیتے جی کس پر کھلا
وحشتِ اہلِ جنوں اس درجہ اب معلوم ہے
رات دن رہنے لگا زنداں کا اب تو در کھلا
بن گئی کنجی زمینِ شعرِ غالب کیا کہوں
یعنی ماھر آج یہ قفلِ سکوتِ آخر کھلا

۵

ع یہ جنونِ عشق کے انداز، چھٹ جائیں گے کیا

رہ کے چٹانوں کی بستی میں بھی، گھبرائیں گے کیا
حالِ دل پتھر کو اپنا، ہم سنا پائیں گے کیا
جسم سے اپنے نکل کر بے کفن جائیں گے کیا
ہم نہا کر اپنے خوں میں تیرے پاس آئیں گے کیا

میں تلاشِ آدمی میں، ہوں جو یوں، ہر سو، رواں
اِس جسارت پر مری، احباب مسکائیں گے کیا
جو فقط اپنے حصارِ جسم میں گم ہو گئے
وہ فضائے لامکاں کی سیر فرمائیں گے کیا
جن کے ہاتھوں گلشنِ تہذیب اُجڑا ہی کیا
مجھ کو بھی وہ موردِ الزام ٹھہرائیں گے کیا
طبعِ نازک پر گراں، مانا کہ ہے، میری انا
یہ متاعِ بے بہا ہم کھو کے پھر پائیں گے کیا
شعر کی گہرائی پنہاں روح میں شاعر کی ہے
شعرِ ماہر مجھ کو حضرت آپ سمجھائیں گے کیا

ع نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

بتاؤں میں تڑپنے کا مزا کیا
نہیں دیکھا ہے تم نے آئینہ کیا

زمیں تانبے کی ہوتی جا رہی ہے
سوا نیزے پہ سورج آ گیا کیا

ہمارے خوں کی لالی کیا بتاؤں
مقابل اِس کے ہو رنگِ حنا کیا

بڑھی کیوں آگ اس تیزی سے گھر یا
دیا ہمسایہ نے اس کو ہوا کیا

جُدا ہر شخص کا رستہ ہوا جب
تو کہنے سننے کا کچھ فائدہ کیا

اسی سے آبروئے زندگی ہے
گئی عزّت تو باقی ہی رہا کیا

بھرے ہیں کان دشمن نے تمہارے
کہا کیا اُس نے اور تم نے سنا کیا

غزل سن لو، زباں ماہر کی دیکھو
سمجھنے سے ہی پہلے مرحبا کیا!

ع صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جب پڑا اُلٹا پڑا، پانسہ مری تدبیر کا
مِٹ نہیں سکتا کبھی لِکّھا کسی تقدیر کا

ہے خدا کے فضل پر موقوف ملنا دہر میں
منزلت، عزت، وجاہت، مرتبہ، توقیر کا

ہو سکے جتنا مرے قاتل چلا خنجر چلا
چلتے چلتے آپ پھر جائے گا مُنہ شمشیر کا

قطرہ قطرہ خون کا نقشِ صداقت بن گیا
کٹ گیا ہر چند کہنے کو گلا شبیرؓ کا

تیرگی میں مِل نہیں سکتے کبھی نقشِ قدم
چھیڑ لے دل ذکر اس کے حُسن کی تنویر کا

کچھ دنوں پہلے تو لب پر اس کے تھا مُہرِ سکوت
ہو گیا ہے شوق ماہرؔ کو بھی اب تقریر کا

ع عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

یہ خیالِ خام ہے ہوگا وہ میرا آشنا
غیر کو دیکھا ہے اکثر ہوتے اپنا آشنا

چھوڑ دیتا ہے بُرے وقتوں میں خود سایہ بھی ساتھ
بے کسی میں کون ہوتا ہے کسی کا آشنا

"جو ہر دستِ دعا" آئینۂ تقدیر ہے
میری "آہِ آتشیں" ہے جیسے عنقا آشنا

وہ شکستِ قیمتِ دل ہی سمجھ سکتا نہیں
جس کا دل ٹوٹا نہ ہو، جو ہو، وفا نا آشنا

"شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ" خاطر ہی رہی
ہوتا عمرِ مختصر میں کس کا کس کا آشنا

میں تو دیوانہ ہوں خود رہتا ہوں "آتش زیرِ پا"
راستے کے پیچ و خم سے میں ہوں تنہا آشنا

سوچ کر کیجئے گا ماھما اُن سے عرضِ مدعا
عرش پر ہے جب دماغ اور دل تمنا آشنا

ع سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اُن کا جب تیرِ نظر یاد آیا
رو دیئے زخمِ جگر یاد آیا

جب اسے میں نے بھلانا چاہا
اور وہ رشکِ قمر یاد آیا

کیا کہوں وحشتِ زندانِ فراق
کبھی صحرا، کبھی گھر یاد آیا

میرا کہنا، مجھے خط لکھیئے گا
اُن کا کہنا کہ اگر یاد آیا

اُن کے وعدوں کا یقیں کر ماھرؔ
آہی جائیں گے اگر یاد آیا

ع ۔ میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کب اشکِ شبِ ہجر سمندر نہ ہوا تھا
ہاں! قطرۂ نیساں ابھی گوہر نہ ہوا تھا

پُرنور ہوا خانۂ دل اُن کے قدم سے
اِس سے کبھی پہلے یہ منوّر نہ ہوا تھا

زلفیں تو سنورتی ہی رہیں بارہا لیکن
آئینہ کبھی رُخ کے برابر نہ ہوا تھا

ہمزاد کی صورت رہی تا عمر اسیری
اِس سے جو رہا ہوتا مقدّر نہ ہوا تھا

ملنا تھا نہ ملتا ہے سکوں دہر میں مجھ کو
حاصل وہ ہوا اب جو میسّر نہ ہوا تھا

ملتی ہی کہاں چھاؤں مجھے وادیٔ غم میں
سایہ بھی مرا قد کے برابر نہ ہوا تھا

دعوئ سخن کرنا، تو اِک بات ہے ماہرؔ
اب تک کوئی شاعر ترا ہمسر نہ ہوا تھا

ع اِک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا

ختم آخر یہ سلسلہ نہ ہوا
پیش کب کوئی حادثہ نہ ہوا
دیکھا روئے یار کی تصویر
دلِ صد پارہ آئینہ نہ ہوا
موت کیا ہے، حیات کیا شے ہے
آج تک حل یہ مسئلہ نہ ہوا
اصل اور نقل میں ہے فرق بڑا
کبھی کوئی صنم خدا نہ ہوا

شرطِ الفت برہنہ پائی ہے
پاؤں میں کس کے آبلہ نہ ہوا
بحرِ ہستی میں عمر چند نفس
پانی میں کوئی بلبلہ نہ ہوا
جا چکی تھی نگاہ منزل تک
حیف! طے وہ بھی فاصلہ نہ ہوا
دوست ہو، یا عزیز ہی کوئی
نہ ہوا، کوئی بھی مرا نہ ہوا

بخششیں اس کی عام ہیں ماہرؔ
ہم تھے کمزور، حوصلہ نہ ہوا

ط۔ دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

اس کی محفل میں کبھی کوئی جو کیا جل گیا
صورتِ پروانہ جس کو اس نے دیکھا جل گیا

رکھتے ہی میرے قدم ویران محفل ہو گئی
تھا رقیبِ فتنہ ساماں سبزہ پیرا جل گیا

آپ کی آواز تھی یا راگ دیپک کا کوئی
سنتے ہی قلبِ پریشاں، شمع آسا جل گیا

آپ نے دل میں لگا دی آگ جو اچھا کیا
کچھ نہیں معلوم کیا باقی رہا، کیا جل گیا

ایک ہی کھویا رہِ الفت میں، پایا سیکڑوں
اپنے پہلو میں تھا اِک دل، اور کیا تھا جل گیا

دیکھ کر ماہرؔ ترقی علم و دولت کی ترے
کل تو جلتا تھا پرایا، آج اپنا جل گیا

ع   کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

لذّتِ زخمِ جگر بتلائیں کیا
یہ بھی صورت ہے کوئی دکھلائیں کیا

آپ ہی کی دوستی پر ناز ہے
بندہ پرورؔ غیر کو اپنائیں کیا

لوگ کھاتے ہیں فریبِ نَو بہ نَو
آپ ہی فرمایئے! ہم کھائیں کیا

راگنی بے وقت کی ہو چھیڑتے
ایسے عالم میں ہم اپنی گائیں کیا

منصب و شہرت کا طالب ہے جہاں
ہم بھی اوروں کی طرح ہو جائیں کیا

آگیا رُخ پر عرق، کافی ہے یہ
اور اب ہم آپ کو شرمائیں کیا

کشتۂ دوراں جو ہو ماٹھا اسے
مرغِ بسمل کی طرح تڑپائیں کیا

ط؎ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

قابلِ قدر تو ہے، دامنِ زنداں ہونا
اُس پہ طرّہ، تری زلفوں کا پریشاں ہونا

سات پردوں میں چُھپا، جوہرِ تابانِ جمال
اس پہ بھی سامنے آئینے کا حیراں ہونا

کتنے ایوانِ فلک بام، زمیں بوس ہوئے
کیا قیامت ہے دلِ زار کا نالاں ہونا

ہمنے مانا کہ یہ ہے آبِ بقا کا منبع
پہلے ثابت بھی تو ہو چشمۂ حیواں ہونا

لاج رکھنی ہے یہاں رہنے کی جانے والو
لالہ و گُل میں کبھی کچھ تو نمایاں ہونا

لایا ایمان، کہ ما آھر بھی ہے، بیشک، شاعر
آج ہی دیکھا ہے کافر کا مسلماں ہونا

۱۵

ع اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

ہمارے جسم سے کانٹا تو اے ستمگر کھینچ
کھٹک ہے زخمِ تمنا میں کوئی نشتر کھینچ

وہ تیرِ نیم نگاہی ذرا مکرر کھینچ
بنا دے اور بھی بسمل کچھ ایسا منظر کھینچ

جمے رہیں گے وفا پر پہاڑ کے مانند
ترا تو شیوہ ہے ناوک چلا کہ خنجر کھینچ

تقاضا حبس زمانہ یہ ہم سے کرتا ہے
گھٹ اور گھٹ کے بھی ہر سانس تک نہ باہر کھینچ

کہوں گا بات وہی سچ جو ہے مرے نزدیک
تو چاہے قتل پہ میرے ہزار خنجر کھینچ

کبھی طلب جو کیا حق، تو کہہ کے دیوانہ
ہزاروں لڑکوں نے مارے ہیں مجھ کو پتھر کھینچ

ہے کون کرتا زمانے میں بات سیدھے منہ
جو آئے دل میں تو دو چار تو بھی پتھر کھینچ

چمک اٹھے مری تقدیر، خالقِ اکبر
کوئی تو ایسا قلم صفحۂ جبیں پر کھینچ

نچوڑ دے اے ماہرؔ، وضو کو کافی ہے
بھگوئے اشک نے جس کو، وہ دامنِ تر کھینچ

جو بادہ نوشی ہی منظور ہے تو اے ماہرؔ
پہنچ کے عرصۂ محشر میں جامِ کوثر کھینچ

ع کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

اہلِ دل، اہلِ وفا، اہلِ رضا میرے بعد
تم ہی کہہ دو کوئی دنیا میں ہوا میرے بعد
لطف جینے کا اٹھائیں گے اٹھانے والے
آئیگا پھر نہ محبت میں مزا میرے بعد
اِک نظر میں تو مرا ہو گیا قصہ ہی تمام
اب کدھر جائے گی دنیا میں قضا میرے بعد
سرخ رُو ہو نہ سکے گا کوئی ہم رنگِ شفق
رنگ لائے گی مگر تیری حنا میرے بعد
یہ تو فطرت ہے نہ چھوڑیگی یہ خصلت اپنی
کیا بدل سکتی ہے یہ آب و ہوا میرے بعد!
وہ بھی کہتے ہیں تو تسلیم ہے مجھ کو ماھرؔ
مجھ سا دنیا میں نہیں کوئی بُرا میرے بعد

ع ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

درِ آپ کا ہم چھوڑ کے اب جائیں کہاں اور
ہے ترکِ تعلق میں خود اپنا ہی زیاں اور

آسان اٹھانا نہ تھا، کچھ بارِ خلافت
جز میرے اُٹھانا بھی کوئی بارِ گراں اور؟

دل ہے کہ کوئی چوبِ تر و تازہ و شاداب
جب آگ سلگتی ہے تو اُٹھتا ہے دھواں اور

ہے فصلِ بہاراں میں چمن شعلہ بداماں
اب دیکھیے کیا ہوتا ہے اندازِ خزاں اور

آزادیٔ گفتار و خیالات کا اظہار
بربادی کے اب اس سے بھی بڑھ کے ہیں نشاں اور

جب شیشۂ دل پر مرے زنگار ہے آتا
کیا کہیے چمکتا ہے مرا داغِ نہاں اور

میں شاخ ثمردار کے مانند ہوں ماہرؔ
فنا ہوں کسی سے تو وہ کرتا ہے گماں اور

ع تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

اگر بجلی کو گرنا ہے تو گر جائے نشیمن پر
کہ ایسے حادثے کتنے پڑے ہیں میرے گلشن پر

مرا ذوقِ چمن بندی بھی ہے صد لائق تحسیں
بجائے ناز کرتا ہوں جو میں تزئینِ گلشن پر

جلانا ہے مجھے اپنا چراغِ زندگی اے دل
اب اس کی روشنی ہے منحصر تیرے ہی روغن پر

اگر توبہ شکن ہونے کی مجھ پہ بات آئے گی
تو کہہ دوں گا کہ اس کا خون ہے ساقی کی گردن پر

کسی کی پرسشِ احوال کا اف رے اثر ماہرؔ
ٹپک پڑتے ہیں دو قطرے مری آنکھوں سے دامن پر

ع کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

رنگ بدلا ہی کیا حال دگر ہونے تک
کیا قیامت یہ قیامت تھی سحر ہونے تک

لو ہوئی جاتی ہے کمزور چراغِ دل کی
خاک ٹھہرے گا یہ کمبخت سحر ہونے تک

ہائے اس خاک نے کیا کیا اُٹھائے طوفاں
اِک قیامت تھی بپا میرے بشر ہونے تک

دل یہ کہتا ہے کہ دن رہتے چراغاں ہوگا
اِک ذرا صبر کرو رقصِ شرر ہونے تک

جانے کتنے ہی مراحل سے گزرتا ہے غریب
تخم پہ کیا نہ گزرتی ہے شجر ہونے تک

دل پہ کیا کیا نہ گزر جائے سمجھ لو ماہرؔ
ذرّے سے بڑھ کے تمہیں شمس و قمر ہونے تک

ط غ   مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ذوقِ طلب جو رکھتا ہے غم کا خزانہ مانگ
اِس کے علاوہ بھول کے کوئی دعا نہ مانگ

قاتل کا تھا قصور نہ خنجر کی چال تھی
ایسے میں میرے قتل کا کچھ خوں بہا نہ مانگ

ڈوبے نہ لے کے یہ رکشِ احتیاطِ شوق
جز شوخیوں کے یار سے رنگِ حنا نہ مانگ

برہم تمام عمر رہی زلفِ کائنات
اب ذوق و آگہی کی نہر لے صبا نہ مانگ

منزل کی ہو تلاش تو بڑھتا ہے جنوں
اپنے دنورِ شوق سے اب راستہ نہ مانگ

نیکی وہی ہے کر کے جو دریا میں ڈال دے
اپنی زباں سے کوئی بھی اُس کا صلہ نہ مانگ

اِک چلتی پھرتی لاش ہیں لوگوں کے یہ ہجوم
ماہرؔ زیادہ اور اب اِن کا پتہ نہ مانگ

ع برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

آپ فرزانہ، جہانِ عشق میں دیوانہ ہم
گلشنِ ایجاد کو بھی سمجھے ہیں ویرانہ ہم

عالمِ دیوانگی بھی دو ورق ہے زیست کا
صبح کو جاتے تھے مسجد، شام کو میخانہ ہم

اس طرح لکھے تو بیشک ہو وہ کوئی داستاں
آپ ہوں گے اس کے عنواں جس کے ہیں افسانہ ہم

پیٹ کے ہلکے نہیں شیشے کی صورت بزم میں
جو چھلک سکتا نہیں، رکھتے ہیں وہ پیمانہ ہم

آپ ہیں ماہر، خفا اور بات اتنی ہے فقط
کہہ دیا کرتے ہیں مُنہ پر، دل کی بے باکانہ ہم

۲۲

ع موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مر ہی گئے تو اب کوئی سوئے مزار آئے کیوں
کون وفا شعار ہے، کوئی دِیا جلائے کیوں

میرے ہی مشتِ خاک پر شیخِ حرم کو ناز ہے
سجدہ کرے تو کیوں کرے کوئی صنم بنائے کیوں

راہِ حیات پُرخطر مانا کہ ہے جہان میں
اپنی مُراد تک مگر کوئی پہنچ نہ جائے کیوں

کہتے نہ تھے کہ دوستی نبھ نہ سکے گی آپ سے
اب جو بگڑ گئی تو پھر کوئی اِسے نبھائے کیوں

ماہرِ خستہ پِس کے میں جذبِ زمین میں ہو گیا
خاک مری چمن میں پھر بادِ صبا اُڑائے کیوں

ع ۔ نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

دل مشتعل ہے سینے میں، لب پر فغاں نہیں
اندر مکان جلتا ہے، باہر دھواں نہیں

مجھ سے ہی تیرے باغ کی ہے ساری آبرو
گر میں نہیں تو پھر یہ ترا گلستاں نہیں

راہِ وفا میں ہم نے جو چھوڑے تھے نقشِ پا
اب دُور، دُور تک کہیں اس کا نشاں نہیں

اللہ رے نور، قطرۂ پیہم میں اشک کے
ایمان سے کہو تو کہ یہ کہکشاں نہیں

بارِ فراق اُٹھ نہ سکے اس سے عشق میں
ایسا بھی ماؔھر آپ کا اب ناتواں نہیں

ع ۔ یہ درد وہ نہیں ہے کہ پیدا کرے کوئی

کب تک امیدِ خام پہ بیٹھا کرے کوئی
کچھ کہنے سے بھی پہلے تو سوچا کرے کوئی

قندیل بجھ رہی ہے تمنّائے زیست کی
اب لاکھ لَو پہ لَو نہ بڑھایا کرے کوئی

گر ہو سکے نہ دل ہی منوّر تو اے ندیم
کیا فائدہ کہ کعبہ کو جایا کرے کوئی

کچھ بندگی کی لاج تو رکھ لے مرے خدا
میں بندہ تیرا اور تماشا کرے کوئی

ماہرؔ کو آرزوئے بُتِ خودسر کی ہو نہ کیوں
دیر و حرم میں اب کِسے سجدہ کرے کوئی

ع کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

زمین ہی کے لئے ہے، نہ آسماں کے لئے
کرم حضورؐ کا ہے عام دو جہاں کے لئے

کلی کا حُسن، گلوں کا شباب، موجِ نسیم
یہ ساری چیزیں ہیں تزئین گلستاں کے لئے

غمِ فراق، غمِ زندگی، غمِ دوراں
بلائیں سیکڑوں اِک جانِ ناتواں کے لئے

وہ اور ہوں گے جو غیروں کے در پہ جُھکتے ہیں
مری جبیں ہے فقط تیرے آستاں کے لئے

کسی کا گوشۂ دامن نہ مِل سکا ماہرؔ
شبِ فراق مری چشمِ خوں فشاں کے لئے

ع ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچّھا کہیں جسے

ایسا نہیں کوئی کہ شناسا کہیں جسے
ملتا کہاں ہے کوئی ہم اپنا کہیں جسے

اِک مرکزِ خیال ہے دُنیا کہیں جسے
کوئی نظر تو آئے کہ تم سا کہیں جسے

سایہ بھی بھاگتا ہو جہاں اپنی ذات سے
وہ ہے سرابِ دشت، تمنّا کہیں جسے

زُلفِ دراز بن کے اُلجھتی رہی مدام
اِک تارِ عنکبوت ہے دُنیا کہیں جسے

ماہرؔ وہی نہ کہتے ہیں سب جس کو آدمی
ہیں خوبیاں ہی کیا کہ ہم اچّھا کہیں جسے

ع اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

یہ جو سمجھ رہے ہو تم محفلِ نا ؤ نوش ہے
بزمِ طرب نہ جانیو دنیا وبالِ دوش ہے

لیل و نہارِ زیست میں لوگ اُلجھ کے رہ گئے
دنیا تو دیدنی نہ تھی، کس کو مگر یہ ہوش ہے

تارِ نفس کا سلسلہ، دار و مدارِ زندگی
عالمِ ہاؤ ہو مگر نالۂ صد خروش ہے

گذری ہے کیا مریض پر کس سے یہ کوئی پوچھے اب
شمع کو آہ کیا کہوں، رکھ کے زباں خموش ہے

ماتھرؔ خوش نوا نے کیا شاعری ترک کر ہی دی
کچھ تو کہو وہ دوستو عرصے سے کیوں خموش ہے

ع اپنا بیان حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

رسمِ جدید سے تو بغاوت نہیں مجھے
لیکن ہے بات اتنی کہ رغبت نہیں مجھے

دُنیا بدلتی رہتی ہے گرگٹ کی طرح رنگ
مجھ سے ہے بدگمان تو حیرت نہیں مجھے

بن کر صلہ عبادت و طاعت کا گر ملے
اے دوستو! پسند وہ جنّت نہیں مجھے

غالبؔ کی طرح مجھ کو بھی حاصل ہے سو شرف
اک شاعری ہی ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

میں تو نثار ہوتا ہوں ماہرؔ خلوص پر
معلوم کچھ طریقِ عبادت نہیں مجھے

ع وہ اِک نگہہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

نظر میں خضر کوئی ہے نہ ابن مریم ہے
عجب بلا میں گرفتار ابن آدم ہے

اُلجھ اُلجھ کے لپٹتا گیا یہاں انساں
بساطِ دہر نہیں، دامِ زلفِ پُرخم ہے

ہمارا آپ کا جینا بھی ہے کوئی جینا
جو دل ہے چاک ہے، جو آنکھ ہے وہ پُرنم ہے

مزاجِ دیر و حرم کل بتاؤں گا تم کو
مثالِ گیسوئے پُرپیچ آج برہم ہے

نہ دل دہی ہے نہ ہے دل بری کہیں ماھر
زمانہ دے مجھے آزار جو بھی وہ کم ہے

ع کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

داغِ دل اپنا کسی طرح دکھائے نہ بنے
اور جو چاہوں جو چھپانا تو چھپائے نہ بنے

دامنِ دل میں وہ جب چاہیں لگا دیں آگ
ہم اگر چاہیں بجھانا تو بجھائے نہ بنے

تم کو منظور نہیں اپنے تغافل سے گریز
ہم پہ بن آئی ہے ایسی کہ بنائے نہ بنے

اُف رے یہ تیرہ نصیبی یہ اندھیرے کا فروغ
دیپ آنکھوں کا جلاؤں تو جلائے نہ بنے

ہائے یہ فطرتِ حسن، اُف وہ مزاجِ نازک
ناز اُٹھانا بھی جو چاہوں تو اٹھائے نہ بنے

سوچ کے دیجئے دیوانے کو دامن کی ہوا
یہ بھی ممکن ہے کہ پھر ہوش میں آئے نہ بنے

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ ماھرؔ کو مگر
دل پہ گذری ہے کچھ ایسی کہ سنائے نہ بنے

ع غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

زلفِ محبوب سے کیا کوئی کہانی مانگے
اُس کا کاٹا نہ زباں کھولے نہ پانی مانگے

تابشِ حسن سے رات اپنی کہانی مانگے
اور تری زلفِ مسلسل کی زبانی مانگے

پھر نظر میری وہی بات پرانی مانگے
نقشِ اوّل سے جو بہتر ہو وہ ثانی مانگے

حیف اگر ذوقِ سخن بات پرانی مانگے
اِس زمانے میں بھی لفظوں سے معانی مانگے

دن ترے عارضِ پُرنور کا قصّہ چاہے
رات مجھ سے تری زلفوں کی کہانی مانگے

حسنِ مغرور کو اِک نیم نگاہی سے بھی بخل
دل وہ نادان کہ مژگاں کی نشانی مانگے

بسملِ عشق کو وہ دن نہ دکھانا یارب
حسن آئینے سے جب اپنی جوانی مانگے

دل کوئی شمع نہیں ہے شبِ ہجراں جس سے
تا سحر سلسلۂ اشک فشانی مانگے

زندگی شوق کی تا حدِّ نظر اک صحرا
دل وہ کشتی ہے جو صحرا سے روانی مانگے

ماہرؔ اُس تشنہ لبی پر مجھے آتا ہے ترس
ہو کے بیتاب بیاباں سے جو پانی مانگے

۳۲

مصرع۔ ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

کتنوں کے ہاتھ کٹ گئے اور سر قلم ہوئے
اُن کے مقابلے میں ستم مجھ پہ کم ہوئے

گو دوشِ ناتواں پہ یہ ہستی بھی بار ہے
پھر بھی یہ سوچتے ہیں گرانبار کم ہوئے

مرنے کا کچھ نشاں ہے نہ جینے کا کچھ ثبوت
ہم لوگ درمیانِ وجود و عدم ہوئے

دنیا پکارتی ہے مگر بولتے نہیں
گویا کہ تم خدا نہ ہوئے اِک صنم ہوئے

دامن ہمارا بھیگ گیا سیلِ اشک سے
اور تیری آستین کے گوشے نہ نم ہوئے

سیرابِ حسن، حسرتِ ذوقِ جمال ہو
نظارے ایسے دہر میں کم ہی بہم ہوئے

مانا کہ خونِ دل میں ڈبولی تھیں انگلیاں
حالاتِ دل نہ اس پہ بھی ہم سے رقم ہوئے

ماھرؔ نے اپنے آپ سے کم دشمنی نہ کی
ہر چند دوستوں کے بھی اُس پر کرم ہوئے

ع رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

اِس طرح کرو تم نہ تماشا مرے آگے
چلنے کا نہیں کوئی بہانہ مرے آگے

کوئی تو محرّک ہے، ہوا ہو کہ خدا ہو
بے وجہ تو ہلتا نہیں پتّا مرے آگے

سورج بھی ہوا سرد سمندر بھی ہوئے خشک
ہوتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

اِک نقشِ قدم ہی سہی کچھ اسکو بھی دے دوں
پھیلائے ہے دامن کو یہ صحرا مرے آگے

آثار بتاتے ہیں کہ کچھ ہو کے رہے گا
امروز ہے آئینۂ فردا مرے آگے

ملنا ہو کہ غم، پیاس پہ موقوف ہے ماھر
چُلّو سے بھی کچھ کم ہے یہ دریا مرے آگے

ع صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے

ہے تخلص اپنا ماہرؔ، عارفؔ اپنا نام ہے
نام سے مطلب نہیں ہے کام ہی سے کام ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہی اس کو جانیے
دیکھنے میں زندگی یوں تو بہت گلفام ہے

ہیں نہاں تابوتِ دل میں اپنے لاکھوں ممیاں
دل ہمارا ہے کہ کوئی مصر کا اہرام ہے

واقفِ اسرارِ فطرت جب سے یہ انساں ہوا
رفتہ رفتہ ہی سہی اب دور از اوہام ہے

شعلۂ انفاس میں اب حدّتِ آتش کہاں
ڈوبتا سورج ہے ماہرؔ زندگی کی شام ہے

ع نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

جامۂ ہستی اُتارا چاہیئے
مر کے یہ پوشاک بدلا چاہیئے

زندگی کی آرزو گر دل میں ہے
پھر تو پتھر سا کلیجا چاہیئے

دھوکے زہراب یہ کب تک پئیں
پتّوں کو اب تو سایا چاہیئے

العطش کا چار جانب شور ہے
اپنا غصّہ آپ پینا چاہیئے

چل رہے ہیں لوگ لاشوں کی طرح
قُمْ بِاِذْنِ اللہ کہنا چاہیئے

امتحانِ ظرف ہے مقصود پھر
آہ کی تاثیر دیکھا چاہیئے

اور بھی باقی غزلخواں ہیں ابھی
بزم سے ماھر کھسکنا چاہیئے

ع   دل کی وہ حالت کہ دَم لینے سے گھبرا جائے ہے

زُلف اُس کی دوش پر جب شام کو لہرائے ہے
صبح تک بادِ صبا بُوئے محبّت لائے ہے

جب شبِ فرقت کبھی دامن ذرا پھیلائے ہے
حسرتِ خوابِ سحر میں دل ہی ڈوبا جائے ہے

موجۂ بادِ بہاری، قاتلِ غنچہ ہوئی
کھلکھلاتی ہے کلی اور پھول سوکھا جائے ہے

چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر شکستِ آرزو
رات کے پچھلے پہر نغمہ جو کوئی گائے ہے

ہم فلک سے بھی نہیں ڈرتے، مگر قلبِ حزیں
اس زمیں کے باسیوں سے خوف کچھ کچھ کھائے ہے

ہاں سمجھ کر کھولئے گا، حضرتِ ماہرؔ! زباں
باتوں باتوں میں یہاں شمشیر چل چل جائے ہے

ع دمِ تیغِ توکّل سے اگر پائے سبب کاٹے

خوشی کے وقت بھی اکثر بصد رنج و تعب کاٹے
جو دُکھ اِس عمر میں ہم نے سہے ہیں تم نے کب کاٹے

یہ عمرِ مختصر ہنس رو کے بھی تو کاٹ لے کوئی
مزا آجائے جینے کا ہماری طرح جب کاٹے

نگاہ و دل کی باتوں کو سمجھنا تھا نہ تم سمجھے
جو رشتے تھے بہم قائم وہ تم نے بے سبب کاٹے

مثالِ بوئے گل ہوتے تو ہیں ہم بھی پریشاں کچھ
مگر آفات جتنے بھی تھے ہم نے ہنس کے سب کاٹے

یہ عالم نزع کا ہے ہچکیاں رہ رہ کے آتی ہیں
نہ جانے آج بیمارِ محبت کیسے شب کاٹے

زمانہ پھر گیا ہم سے گزاری رنج و غم سہتے
چلو چھٹی ہوئی اب تو بہت غیظ و غضب کاٹے

صف آرا ہے زمانے میں فجور و فسق کے پلٹن
طنابِ خیمۂ ایماں نہ کوئی بولہب کاٹے

جو چھوٹے ہیں کبھی تم سے وہ یاد آتے بھی ہیں تم کو
یہ لمحاتِ جدائی تم نے اے ماہر غضب کاٹے

PDF By :
Ghulam Mustafa Daaim Awan